اکیسویں صدی اور میر تقی میر

MEER TAQI MEER AND 21ST CENTURY

ڈاکٹر مختار احمد عزمی[1] / عبدالباسط یاسین[**]

Abstract:

Muhammad Hasan Askri had announced the death of literature, particularly that of Urdu literature. Then question arises, what is the relevance of Mir Taqi Mir with 21st century Urdu literature? In the age of globalization, several languages and literatures has been demised .Urdu is also in a defensive position. Mir Taqi Mir is also at risk .Another question arise about our nostalgic studies of Mir. In the 19th and 20th centuries, Mir had been established as No.1 Urdu poet, but what is relevance and position of Mir in the 21st century. The detailed answer is given in this article

Key words: Mir Taqi Mir, 19th, 20th centuries, Urdu literature, 21st century, scenario, Covid 19 effects. Relevance.

میر تقی میر کی ضرورت، عہدِ حاضر میں کیا ہے؟ میرے اِس سوال کی بنیاد انکارِ میر نہیں بل کہ وہ خوف ہے جو گزشتہ صدی میں محمد حسن عسکری نے، ادب کی موت کا اعلان کر کے پھیلایا تھا. جو رہی سہی کسر تھی وہ اکیسویں صدی میں طاہر مسعود نے "اردو ادب کی موت" نامی کتاب لکھ کر پُوری کر دی ہے۔ محمد حسن عسکری نے لکھا تھا۔

"ادب کا تابوت سر پر اُٹھائے پھرنے سے فائدہ؟ اب تو دفنا ہی دینا اچھا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"(1)

اس کے ساتھ ہی وہ اردو ادب کی موت کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔

"بہتر تو یہ ہے کہ اب ہمیں یہ بھی نہیں سوچنا چاہئے کہ اُردو ادب مرا کیوں؟ یہ بھی ان لوگوں کا کام ہے جو کبھی ادب کو قبر سے نکالیں گے۔ ہمیں تو بس اپنے آپ کو اس لاش سے آزاد کرنا ہے۔ یہ ہمیں دنیا کا اور کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ یوں کسی کا جی چاہے تو چوری چھپے ادب 'کر لیا' کرے۔ لیکن جائزہ نگاروں کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے اگر 'بحیثیتِ مجموعی' اردو ادب کی موت کا اعلان ہو جائے تو بہتر ہے۔"(2)

ادب اور بالخصوص اردو ادب کے حوالے سے محمد حسن عسکری کی طرف سے اعلانِ موت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اردو کے ادبا و شعرا غیرت کی گولی کھائیں اور کچھ بہتر ادب تخلیق کریں۔ اس کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ انگریزی راج کے بعد اُردو نہ صرف اپنے گھر یعنی برصغیر میں مسلسل زوال پذیر ہے بل کہ یہ مفاد پرستوں اور ابن الوقتوں کے نرغے میں پھنس گئی ہے۔۔ یہ حقیقت ہے کہ برصغیر میں 1857ء تک بل کہ تقسیم ہند کے وقت تک، مسلم گھرانوں میں عربی فارسی اور اردو کا رواج عام تھا۔ پھر ہوتے ہوتے یہ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ انگریزی اور مادیت لینے لگی۔ دم توڑتے ہوئے ادب اور اقدار کے حوالے سے طاہر مسعود کا کہنا ہے:

"ادب کی موت کوئی ایسا سانحہ نہیں جسے آسانی سے بھلا دیا جائے اور اس کے اسباب و عوامل پر غور و خوض کئے بغیر نظر انداز کر دیا

---

[1] شعبہ اردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور

[**] پی ایچ ڈی اُردو سکالر، منہاج یونیورسٹی، لاہور

جائے۔ادب کی موت کے معنی ان اعلا اقدار کی موت ہے جو انسان کو رفعت و سربلندی عطا کرتی ہیں اور اسکے جذبات کی تہذیب کے ذریعے اسے بہتر انسان بنا کر معاشرے کو نیکی، خیر اور حسن سے روشن و آباد کرتی ہیں۔"(3)

اب ایک طرف ادب اور ادیب کی روز افزوں ناقدری ہو اور دوسری طرف میر تقی میر کی لمحہء موجود میں اہمیت اور ضرورت کا سوال اُٹھے تو میرے ایسے خام کار اور مجبور رقاری کا پزل ہونا بنتا ہے! ایسے میں صبر مونس ہجراں نہ رہے اور گریہ جاتا رہے تو بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

اِس میں کوئی شک نہیں کہ دو ڈھائی سو برس سے، میر تقی میر کی شہرت مسلمہ ہے۔ ہر بڑے شاعر اور نقاد نے میر کی عظمت کا لوہا مانا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں کووڈ19 نے تو بڑے بڑے مسلمات پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر نُوری:

یک رنگ کردیا ہے اس عفریت نے انہیں
وہ شاد کام لوگ ہیں یا تشنہ کام لوگ

میر کی شہرت وقبولیت کے ہوتے ہوئے یہ سوال اٹھانا کچھ عجیب سا لگتا ہے کی میر کی ہمارے زمانے سے کیا نسبت یا ریلیونس بنتی ہے۔؟ صرف میر ہی نہیں بل کہ سبھی شعرا اوادبا کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے؟ جہاں زندگی اور موت ہم معنی ہو گئے ہوں وہاں کیسا ادب اور کیسی شاعری؟ مستنصر حسین تارڑ، اپنے تازہ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں لکھتے ہیں:

"یہ محبت کرنے کے دن نہ تھے، محبت موخر کرنے کے دن تھے۔۔یہ تنہائیوں کے دن تھے۔۔۔ایسی تنہائیاں، جن کی کوئی حد نہ تھی۔۔۔کون تھا جو پیش گوئی کرسکے کہ اِن کا اختتام سو برس میں ہو جائے گا۔۔شاید وقت کا اختتام ہو جائے پر یہ اُن کی حدود سے بھی پار تک چلی جائیں، ماورا ہو جائیں، زمانوں سے اور قرنوں سے اور چھید کردیں اس کائنات کیان دیکھی چادر میں اور کسی اور کائنات کی مسافت اختیار کرلیں۔۔یہ ایسی تنہائیوں کے دن تھے۔۔۔" (4)

2020ء میں کووڈ19 کی تنہائی، اس قدر سفاک تھی کہ میر کے زمانے کی سفاکی بھی کم دکھائی دیتی ہے۔ میر کے زمانے کی ناپُرسی صرف برصغیر تک محدود تھی جب کہ کووڈ19 میں انسانیت کا کرب عالمی سطح کا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ حادثہ ایک دم نہیں ہوا بل کہ وقت کئی صدیوں سے اس کی پرورش کر رہا تھا۔اِن بلاؤں کا آغاز چند صدیاں پہلے ہوا تھا جب یورپ میں صنعتی دور کی آمد ہوئی اور استعماریت کے پھیلاؤ کی وجہ سے زندگی میں تحرک اور تیزی میں اضافہ ہونے لگا۔

سولھویں صدی میں یورپ کا صنعتی استعمار پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ اسی صدی میں، برّصغیر میں بھی یورپی اقوام کی آمد شروع ہوئی۔ جنگِ پلاسی(1757ء) میں نواب سراج الدولہ کی شکست اور شیرِ میسور کی سرنگاپٹم میں شہادت (1799ء) کے بعد ایسٹ انڈیا کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کے باعث ہندوستانیوں کی زندگی میں بھی لوٹ مار اور تیز رفتاری کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ جو علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آتے جا رہے تھے وہاں زندگی کا تحرک زیادہ تھا۔ مجموعی طور پر اٹھارھویں صدی کا ہندوستان انتہائی افتراق وانتشار کا شکار تھا۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اردو شاعری کے حوالے سے اسی دور کو "اردو شاعری کا عہدِ زریں" بھی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک گراف بنا کر نہایت اختصار کے ساتھ واضح کیا ہے کہ میر و سودا کا دور اخلاقی، سماجی اور سیاسی انحطاط کے علی الرغم اردو غزل کی بلندی کا دور ہے۔(5) اس سنہرے دور میں میر تقی میر کا وافر حصہ ہے۔ اُس کی درد بھری شاعری ہمیں اب بھی تڑپاتی ہے۔

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اِس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا؟

انیسویں صدی کے آغاز میں جب میر دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، ہندوستان غیر ملکی غلامی میں جکڑا جا رہا تھا۔ عوام و خواص سب پریشان حال تھے مگر اُس دور میں بھی میر کی عظمت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

یہاں ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ میر کی شاعری کی کیا نسبت ہمارے آج کے زمانے سے بنتی ہے۔ تب ہی تو یہ اشعار ہمیں آج بھی تڑپاتے ہیں۔ شعرِ میر کی یہ کشش ہی میر کی حیاتِ جاودانی ہے، ورنہ کون کسی کو یاد رکھتا ہے؟۔۔۔ یہاں ہمیں ہمارے پہلے سوال کا جواب تو مل جاتا ہے لیکن ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے۔؟ کیا درد کا موسم ٹھہر تو نہیں گیا؟ ہم جسے گزرا ہوا وقت سمجھ رہے ہیں، ہو سکتا ہے، وہ گزرا ہی نہ ہو؟ بہ قولِ مصحفی:

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہء نوبہار ٹھہرے گا

کچھ ایسی ہی کیفیت میر بیان کرتے ہیں:

بُرے حال اُس کی گلی میں ہیں میر
جو اُٹھ جائیں یاں سے تو اچھا کریں

کہا جاتا ہے کہ خطابت اور ڈراما دوسروں سے لڑائی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں جب کی شاعری اور تصوف اپنے آپ سے لڑائی کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ شاعری میں ایک شاعر اپنے حیوانی وجود سے کس قدر اُوپر اٹھ سکا ہے۔ اس حوالے سے اکثر ہربرٹ ریڈ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ہر شخص دو آدمیوں سے مل کر بنتا ہے، ایک حیوانی آدمی اور دوسرا سماجی آدمی، شاعری دونوں کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ دینِ اسلام کی اصطلاح میں اسے نفس امارہ اور نفس لوامہ کہہ لیجئے۔ ہربرٹ یڈ کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مستقل فاتح اور دوسرا ہمیشہ کے لیے مفتوح نہ ہو جائے بل کہ دونوں میں ایک خوشگوار توازن ہونا چاہیے۔ سلیم احمد کا خیال ہے۔

" اُردو میں حیوان اور سماجی انسان کے توازن کی تو صرف ایک ہی کامل مثال ہے، میر۔ کشمکش اور توازن کے دائمی سفر میں میر کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ تو ایک ایک لمحہ پر ایک منزل سر کرتا نظر آتا ہے۔ میر کو دیکھ کر تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اردو شاعری کے عشق میں ناممکن الحصول معشوق کتنی بڑی نعمت ہے۔،،(6)

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا
رہوں ہوں برسوں سے ہم دوش پر کبھو ان نے
گلے میں ہا تھ مر ا پیار سے نہ ڈال لیا

بیسویں صدی کو انقلابات کی صدی کہا گیا ہے۔ اِس میں نظامِ عالم کئی بار منتشر ہوا۔۔۔۔۔۔ جنگِ عظیم اول، جنگِ عظیم دوم اور کئی چھوٹی بڑی جنگوں نے کرہ ارض کی شکل کئی بار بدل ڈالی ہے۔ 1989ء میں شکستِ روس کے بعد یک قطبی دنیا وجود میں آئی مگر اُردو کے اہلِ

شعرا اور اہلِ نقد و نظر کی تحریروں میں اور تقریروں میں میر زندہ تر ہو گیا۔

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

ناصر کاظمی کا خیال ہے کہ ان اشعار میں:

''یوں دیکھئے تو میر صاحب، غالب اور اقبال کے آنے کی خبر دے گئے ہیں۔''(7)

اکیسویں صدی میں انسان محوِ حیرت ہے۔ ایک طرف تو دنیا گلوبل ولیج کا روپ دھار چکی ہے اور دوسری طرف، زندگی اعتبار و بے اعتباری کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی ہے مگر میر تقی میر اب بھی نصابوں، کتابوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں زندہ ہے۔ میر کی اِس جادو نگاری کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔ اس سے موجود اور مستقبل کے لکھنے والوں کی راہیں روشن ہوں گی۔ بہ قولِ ناصر کاظمی:

''میر کا زمانہ رات تھا اور ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی ہے۔''(۸)

بہت میر ہم پھر جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

اکیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی 11/9 کے خود ساختہ حادثے اور اُس کے ردِّ عمل میں ٹوٹنے والی تباہی نے نظامِ عالم ایک بار پھر تہ و بالا کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کووڈ19 نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ شہر خالی کوچہ خالی، ساغر و مے خانہ خالی۔ ایسے عالم میں جہاں عہدِ حاضر کے بڑے بڑے سخنوروں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں دل خراشیوں کو رقم کیا وہاں میر تقی میر کی آواز بھی ہماری ہمسفر رہی ہے۔

حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب
اِس درد مندِ عشق کی میں کیا دوا لکھوں

دوسرے مصرعہ کو اگر یوں پڑھا جائے تو بالکل آج کا شعر لگے گا:

حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب
اس درد مندِ کووڈ کی میں کیا دو ا لکھوں

میر کا یہ مشہور شعر دیکھئے کہ کووڈ سے پہلے اس کا مفہوم کیا تھا:

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے ان اچھی آنکھوں والوں کا

کووڈ19 کے دوران میں بھی اور بعد میں بھی اس شعر کی معنویت برقرار ہے۔ ہمارے زمانے سے میر کی یہی ریلیونس بنتی ہے۔ کلاسیک کی یہی تعریف کی گئی ہے کہ حادثاتِ دہر اور گزرانِ وقت ان کی اثر پزیری کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ شعر دیکھئے۔ یہ تو بالکل آج کے زمانے کا لگتا ہے۔

کیا پہناوا خوش آتا ہے اِن لڑکے چسپاں پوشوں کو
مونڈھے چپسے ہیں، چولی پھنسی ہے، ٹیڑھی ٹیڑھی کلا ہیں ہیں

مجھے اپنی میر شناسی کا دعویٰ نہیں لیکن احمد جاوید کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہوں۔ وہ اشعارِ میر کی تفہیم کے حوالے سے، کچھ دن پہلے (9) کہہ رہے تھے کہ میر تقی میر کے درج ذیل اشعار اردو کے بڑے اشعار میں شامل ہیں۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بُلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

آخر میں ایک بات اور کہ گزشتہ دو سو برس میں میر کو اکثر ناقدین نے سدا رونے دھونے والا اور ہجر نصیب ثابت کیا ہے۔ اس کی دیوار کی نمی اور کاغذ کے گیلے پن کی بار بار مثالیں دی گئی ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ میر کو شاعرِ شورانگیز بھی ثابت کر دیا گیا ہے۔ بہ قول شمس الرحمٰن فاروقی :

"شعرِ شورانگیز پڑھنے والوں نے عام طور پر دو باتیں محسوس کی ہوں گی کہ اس کتاب کے صفحات پر جو میر ہمیں نظر آتا ہے، وہ اس میر سے بہت مختلف ہے، لوگ جس سے مروج کتابوں کے ذریعے آشنا ہیں۔ شعرِ شور انگیز میں میر کا کوئی سٹیریو ٹائپ نہیں ملتا۔"(10)

اب میر کی شاعری کا تھیسز ہو چکا اور اینٹی تھیسز بھی۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے شعریاتِ میر کا سنتھیسز بھی آ جائے گا۔ بل کہ ڈاکٹر خوجہ محمد زکریا نے کسی حد تک سنتھیسز بیان بھی کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میر ذہنی طور سے مردم بیزار نہ تھے۔ وہ ہنگامہء حیات سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور چہل پہل کی ایسی صورتوں کو پسند کرتے تھے جن سے تنہائی کا احساس دور ہو۔۔۔ ان میں تناسب اور ربط و نظم، حیات اور سلیقہ و موزونیت سے خاص مسرت پا کر غم کو راحت بنا لینے کا میلان موجود ہے۔۔۔ ہلچل، حرکت اور ہنگامے سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔"(11)

گویا میر تقی میر، اکیسویں صدی میں بھی زندہ ہے اور ریلیونٹ ہے۔ بہ قول سلیم احمد :

موجِ ہوا کو لکھنے والا، پیروں کی زنجیر لکھے
بات وہی ہے ایک غزل کی، میں لکھوں یا میر لکھے (12)

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری،اداریہ جھلکیاں مشمولہ: اردو ادب کی موت، مرتبہ: طاہر مسعود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ستمبر 1953ء، ص16

2۔ ایضاً ص 11

3۔ ایضاً ص 13

4۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 2020ء، ص20

5۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 1999ء، ص165

6۔ سلیم احمد مضمون ، نئی شاعری نامقبول شاعری، کراچی: نفیس اکیڈمی، 1989ء، ص56

۷۔ ناصر کاظمی، انتخابِ میر، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، 2001ء، ص57

8۔ ایضاً

9 ۔ احمد جاوید وٹس ایپ بیانِ مجلس ،لاہور، ۱۳ اگست ۲۰۲۱ء، 10 بجے شب

10۔ شمس الرحمان فاروقی، شعرِ شور انگیز، جلد اول، لاہور: اظہار سنز، 2013ء، ص 159

11۔ خواجہ محمد زکریا، مختصر تاریخ مسلمانانِ پاکستان و ہند، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، 2016ء، ص 140

12۔ سلیم احمد، کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، 2003ء، ص265